ٹھیک کرتا ہوا باہر نکل گیا۔

''کیا ہوا؟'' نعیم نے وہیں بیٹھے بیٹھے مہندر سنگھ سے پوچھا۔

''قتل ہو گیا۔''

''کون؟''

''ہمارا بھائی...... چچیرا۔''

''کیوں؟''

''پانی لگا رہا تھا۔''

''پھر؟''

''زیادہ باتیں مت کرو۔ ہم آج ان کا صفایا کریں گے۔''

''کیسے؟''

''جیسے انہوں نے کیا۔ تم سمجھتے نہیں ہو؟''

''یہ تو مشکل ہے۔ نہیں؟''

''مشکل ہے؟'' مہندر سنگھ شرابی آواز میں چیخا۔ پھر چھاتی پر ہاتھ پھیرتا ہوا بولا ''چلو گے؟ ہم اپنے دوستوں کے ساتھ [illegible] جا رہے ہیں۔''

''بکو مت۔ میں تمہارے ساتھ جاؤں گا۔'' نعیم نے کہا اور باہر نکل آیا۔

رکھوالی کے لئے فصل میں سونے کی آج اس کی باری تھی۔ وہ شیشم کے پیڑ پر مچان میں دبکا ہوا لحاف کے اندر گھٹنے سینے سے لگائے سو رہا تھا کہ ایک جھٹکے سے اٹھ کر بیٹھ گیا۔ ایک سایہ نیچے کھڑا اس کی پسلی میں بلم کی نوک چبھو رہا تھا۔

''کیا ہے؟'' اس نے پوچھا۔

''ہم جا رہے ہیں۔''

وہ نیچے اتر آیا۔

''تمہارے پاس کچھ ہے؟''

''نہیں۔''

''آؤ۔ ہمارے پاس سب کچھ ہے۔'' مہندر سنگھ نے بھاری آواز میں کہا۔ کیکر کی شراب کی تیز بو نعیم کی ناک میں گھسی۔ اندھیرے میں بڑے بڑے قدم اٹھاتے ہوئے انہوں نے دوسروں کو جا لیا۔ یہ مہندر سنگھ کے تینوں بھائی کلدیپ کور اور اس کی ساس تھے۔ مردوں کے بدن پر ایک ایک لنگوٹ تھا اور ان کے تیل ملے ہوئے سیاہ جسم اندھیرے میں چمک رہے تھے۔ عورتوں نے سروں پر ٹوکریاں اٹھا رکھی تھیں۔

''عورتوں کو لے کر لڑنے جا رہے ہو۔'' نعیم نے پوچھا۔ کسی نے جواب نہ دیا۔

وہ خاموشی سے سرسبز کھیتوں کے بیچوں بیچ مغرب کی سمت بڑھتے رہے۔ فصلوں کو پانی دیا جا رہا تھا۔ پچھلی رات کی سرد، بوجھل ہوا کے ساتھ ہی تیل، شراب اور گیلی مٹی کی ملی جلی بو بھی ان کے ساتھ ساتھ چل رہی تھی۔ گندم کی نوعمر بالیوں میں نرم ریشمیں دودھ بھرے دانے پڑنے شروع ہو گئے تھے۔ وہ نہر کی پٹڑی پر چڑھ آئے۔ بادلوں کی تاریکی میں صرف بہتے ہوئے پانی کا دھیما شور سنائی دے رہا تھا۔

ایک جگہ مہندر سنگھ رک گیا۔ ''یہاں......'' اس نے بلم کے پھل سے کھیت کے ٹوٹے ہوئے کنارے کو چھوا جہاں پانی ایک چھوٹے سے گڑھے میں جمع ہو گیا تھا۔ ''یہاں پر وہ پانی لگا رہا تھا۔''

''انہوں نے پانی کیوں توڑا؟'' نعیم نے پوچھا۔

''انہیں نہیں ملا تھا۔''

''یہ تو کوئی وجہ نہیں۔''

''سلور ... ایک ... سے مر گیا۔''

''چپ رہو۔'' جوگندر سنگھ دانت پیس کر نیچی آواز میں چیخا۔

وہ دریا پار کھڑے تھے۔ تین آدمی کنارے پر ... گھاس پر لحاف اوڑھے ... تھے۔ تینوں سکھ بھائیوں نے ایک ... [illegible] ... کے سینوں میں اتار دیئے۔ مہندر سنگھ نے بلم نعیم کو پکڑا دیا، لپک کر ماں کی ٹوکری سے تلوار نکالی اور ایک ایک وار میں ان کے سر جدا کر دیئے۔ وہ آواز نکالے بغیر مر گئے۔ نعیم بلم پکڑے دریا کے کنارے جا کھڑا ہوا۔ اس کی آنکھیں جل رہی تھیں اور حلق میں سے کڑی نکل رہی تھی۔ سرخوشی کی وجہ سے کپکپاہٹ جو اس پر طاری تھی، سارے بدن پر پھیل گئی۔

مردوں نے چارہ کاٹنے والے ٹوکوں سے مرے ہوئے آدمیوں کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے کئے اور عورتوں نے ٹوکریوں میں بھر بھر کر انہیں دریا میں بہا دیا۔ پھر انہوں نے لالٹین جلائی اور خون آلود زمین کو کدال سے کھدوا۔ پھر کلدیپ کور اور اس کی ساس نے بڑی پھرتی اور صفائی سے مٹی ٹوکریوں میں لاد لاد کر دریا میں بہا دی۔ زمین کو ہموار کرنے کے بعد وہ خاموشی سے واپس لوٹے۔ نعیم کو اپنے منہ میں خون کا مزا محسوس ہونے لگا۔ اس نے کھنکار کر تھوکا اور اسے لگا کہ اس نے بہت سے پتھر کھا لئے ہیں جو اس کے معدے میں جا کر بیٹھ گئے ہیں۔

آخری تاریخوں کا کمزور سا چاند بادلوں میں سے ظاہر ہوا اور مہندر سنگھ کی آنکھیں، جو شراب اور خون کی وجہ سے سرخ ہو رہی تھیں، نظر آنے لگیں۔ اس نے چلتے چلتے ہاتھ بڑھا کر کلدیپ کور کے سینے پر پھیرا۔ لڑکی ہونٹ چبانے لگی۔ نیم تاریک رات میں وہ سایوں کی طرح سبز ریشمی فصلوں کے بیچوں بیچ چلتے رہے۔

چارے کے ایک کھیت پر پہنچ کر مہندر سنگھ رک گیا۔

''بوری کے لئے چارہ نہیں ہے۔'' وہ بڑبڑایا۔

''اور تیرا کیا ارادہ ہے اب' ہیں؟'' جوگندر سنگھ غصہ دبا کر بولا۔

''چارا کاٹوں گا۔''

''بے وقوف مرے گا؟ تیری عقل کہاں گئی ہے؟''

''اور تیری ماں بوڑھی بھوکی مر جائے؟'' مہندر سنگھ بلم کا پھل گیلی زمین میں گاڑ کر بولا۔

''آہستہ بول' جانور۔ چاروں طرف لوگ کھیتوں کو پانی لگا رہے ہیں۔ چل۔''

''جاؤ......'' مہندر سنگھ چلایا۔ ''میں چارہ لے کر آؤں گا۔''

اس کی آواز بند کرنے کے لئے سب جلدی سے روانہ ہو گئے۔

''تو کہاں جا رہی ہے؟'' مہندر سنگھ بلم کا چوبی دستہ کلدیپ کور کے پیٹ میں گاڑ کر بولا۔ ''خاوند کے ساتھ سونے کے لئے اب کوئی وقت نہیں۔ چل' چارہ کٹوا۔''

جوگندر سنگھ کھیت کے کونے پر جا کر رکا' چند منٹ تک اندھیرے میں اپنی بیوی اور بھائی کو دیکھنے کی کوشش کرتا رہا' پھر زیر لب گالیاں دیتا ہوا چلا گیا۔

پگڑی میں اڑسی ہوئی درانتی نکال کر مہندر سنگھ نے کھیت کے درمیان سے چارہ کاٹنا شروع کیا اور مشین کی سی تیزی سے [illegible] جگہ خالی کر دی۔ کلدیپ [illegible] باندھ کر گٹھڑی میں بھرتی گئی۔ مہندر چارے کی پوان کے ارد گرد منڈلا رہی تھی۔ رات تاریک اور سرد تھی۔ بادلوں نے ہوا کو بند کر رکھا تھا اور ساری کائنات ایک بہت بڑے سیاہ کوٹھے کی طرح دکھائی دے رہی تھی۔ دریا کا ہلکا شور دور سے ان کے کانوں میں آ رہا تھا۔ ایک سایہ کھیت کے کونے پر نمودار ہوا اور مہندر سنگھ لیٹ گیا۔

''لیٹ جا۔'' اس نے سرگوشی کی۔ کلدیپ اوندھی لیٹ گئی۔ نیم تاریکی میں اس کا ابھرا ہوا سینہ مہندر سنگھ کو نظر آ رہا تھا۔ سایہ' جو کوئی پانی لگانے کو جاتا ہوا کسان تھا۔ ہاتھ میں کدال پکڑے خاموشی سے گزر گیا۔

''تیرا سینہ چارے کے اوپر دکھائی دے رہا تھا۔ اوندھی لیٹا کر۔'' مہندر سنگھ نے کہا' ''اگر وہ دیکھ لیتا ماں کا یار تو......''

''تو ایک اور سہی نا'' کلدیپ کور نے کہا۔ ''تمہارا بلم تو ابھی سلامت ہے۔''

''بک بک مت کر...... ادھر آ۔''

وہ آ کر اس کے پاس بیٹھ گئی۔ ''چلو چلیں۔ سویر ہونے والی ہے۔''

مہندر سنگھ نے اس کے سخت سینے پر ہاتھ رگڑا۔

''جانور......'' وہ اندھیرے میں چیخی۔

''تھک گیا ہوں۔'' اس نے بانہیں پھیلا کر سرد چارے پر لوٹ لگائی۔

''مجھے سردی لگ رہی ہے۔''

''ادھر آ''

وہ اس کے برابر لیٹ گئی۔

''اب بھی سردی لگتی ہے؟'' مہندر سنگھ نے اسے کس کر اپنے ساتھ لپٹاتے ہوئے کہا۔ ''بتا۔ اب بھی لگتی ہے؟''

''تمہارے تئیں نہیں ہو۔''

''نہیں....''

''تمہارے سر سے بو آ رہی ہے۔''

''حرام زادی۔''

''مت دبا۔'' وہ دانتوں کے درمیان سے چیخی۔ ''میری سانس رک رہی ہے۔''

وہ ہنسا۔ ''میں اور بھی زور سے دبا سکتا ہوں۔''

''سئور، تم مجھ سے زیادہ زور آور نہیں ہو......''

''میں سب سے زیادہ زور آور ہوں۔'' وہ ہنسا اور ٹانگیں اس کی ٹانگوں میں پھنسا کر چارے پر لوٹنے لگا۔ ایک دوسرے سے جڑے ہوئے وہ دور تک لوٹتے ہوئے چلے گئے۔ نرم سبز چارہ ان کے نیچے دبتا اور سر اٹھاتا رہا۔

''جانور، بیل کی اولاد۔ چھوڑ مجھے۔'' وہ رک رک کر بولی۔

''میں سب سے زیادہ طاقت ور ہوں۔''

''...... سے زیادہ زور آور ہے۔''

''تیری ماں کا یار وہ مجھ سے زیادہ طاقت ور ہے؟''

''اس سے تو آج سب کانپتے ہیں۔''

''حرام زادی۔'' اس کی گرفت ڈھیلی پڑ گئی۔

''غلط ہے یہ؟''

''سئورنی، تیرے باپ تجھے جوان کا رونا روتی ہے؟'' تھوک اس کے نرخرے میں اٹک گیا اور وہ اٹھ کھڑا ہوا۔

''رات حرام کر دی۔''

اس نے بلم اٹھا کر چارے کے ڈھیر پر مارا۔ پھل دوسری طرف نکل گیا۔ کلدیپ کور نے بال سمیٹ کر جوڑا بنایا، بلم نکال کر اسے پکڑایا اور ٹوکری اٹھا کر اس کے پیچھے پیچھے چلنے لگی۔ کافی دیر تک خاموشی سے چلتے رہنے کے بعد مہندر سنگھ نے اونچی آواز سے گانا شروع کر دیا۔

''کوئی سن لے گا۔'' کلدیپ کور نے کہا۔ وہ گاتا رہا۔

جب وہ گھر میں داخل ہوئے تو صبح کا ستارہ منڈیر کے پاس چمک رہا تھا اور اس کی ساس لکڑی کی بالٹی اٹھائے گائے دوہنے کے لئے جا رہی تھی۔

''اتنی دیر لگا کر آئی؟''

UrduPhoto.com

''اپنے بیٹوں کو تھوڑا دیا کرنا کھانے کو۔ کتے کی طرح ہر وقت تنگ کرتے ہیں۔'' اس نے کہا اور سیدھی کھاٹ پر چلی گئی۔

(۷)

کٹائی شروع تھی۔ روشن پور کا ہر فرد اور ہر جانور کام میں مصروف تھا۔ صرف پرندے اسی طرح آوارہ پھرتے اُڑ رہے تھے۔ کڑکتی دھوپ اور لو کی وجہ سے کسانوں کے جسم سیاہ ہو گئے تھے اور عورتوں کی مٹکیوں میں گھی ختم ہو چلا تھا کہ ہر کٹائی کرنے والے کو پاؤ سیر مکھن روٹی پر لگانے کو چاہیے تھا۔ چوپایوں کی پسلیاں نکل آئی تھیں۔ عورتوں کے چہروں اور ہاتھوں پر خشکی کے سفید دھبے پڑ گئے تھے اور ان کے بال کھردرے ہو چکے تھے۔ بچوں کی ٹانگیں پتلی اور پیٹ بڑھ گئے تھے اور یہ حالت ہر جاندار کی مشقت اور زندگی کی سختی کی وجہ سے ہو جاتی ہے۔

لیکن کسان اپنے کپڑے گھن آلود چہروں اور دھنسی ہوئی آنکھوں اور گالوں کے باوجود ایک سو بیس درجے کی گرمی میں کام کرتے ہوئے خوش تھے کیونکہ سامنے ان کی بھاری، پکی ہوئی فصل کھڑی تھی۔ وہ درانتیاں چلاتے ہوئے، اِدھر اُدھر کی باتیں کرتے ہوئے مذاق میں گالیاں دیتے ہوئے سنہری میٹھی گندم کاٹ کاٹ کر ڈھیر کرتے جاتے تھے۔

کٹائی کے تیسرے دن زیادہ تر کھیت صاف کئے جا چکے تھے اور جگہ جگہ کاٹی ہوئی فصل کے انبار لگے تھے۔ گاؤں کا ہر بشر کام کرنے کو کھیتوں میں نکل آیا تھا۔ عورتوں کے رنگ برنگ کپڑوں اور مردوں کے کالے جسموں کا سیلاب ہر طرف پھیلا ہوا تھا اور ایک اندرونی مسرت کا دھارا تھا جو کسانوں کی آنکھوں اور ہاتھوں سے پھوٹا پڑتا تھا کہ یہ ان پڑھ لوگ قہقہہ لگا کر ہنسنا نہیں جانتے۔ ان کی خوشی حرکت اور عمل سے واضح ہوتی ہے۔

مہندر سنگھ کے کھیت پر پہنچ کر نیاز بیگ نے رسیوں پر جسم کا سارا بوجھ پھینک کر بیلوں کو روکا اور گاڑی پر بیٹھا بیٹھا بولا۔

''میں کل بھی آیا تھا۔''

مہندر سنگھ کھیت میں سے اٹھ کر آیا اور گاڑی کی ہتھی پر کہنی رکھ کر کھڑا ہو گیا۔ ''واہگرو چوہدری، کیا بات ہے؟''

''اللہ کرم کرے۔ تمہاری آنکھ کیوں سرخ ہو رہی ہے؟''

''پسینہ پڑ گیا ہے۔ پسینہ تو مادر چود کسی کی طرح بہتا ہے۔'' اس نے آسمان کی طرف دیکھا۔ فضا میں مٹیالے رنگ کی دھوپ اور میلا سا غبار بکھرا ہوا تھا۔ آسمان پر چیلیں زبانیں نکالے اڑ رہی تھیں اور چاروں طرف سے اُمڈتی ہوئی گرمی اور حبس زمین پر مرکوز تھا۔

''طوفان کے آثار ہیں۔'' اس نے گالی دی اور درانتی کے دستے سے ماتھے کا پسینہ پونچھا۔ ''میں مطلب

سے آیا تھا۔" نیاز بیگ نے کہا اور داڑھی کھجانے لگا۔ پھر اسے چھوڑ کر بیلوں کی پشت پر انگلیاں بجانے اور سر اٹھا کر چیلوں کو دیکھنے لگا۔

"واہگرو۔ چوہدری کیا بات ہے؟"

"تمہارے جگ ہے؟"

"کیسی جگ؟"

"ہمارا اگلا شاید بچ رہے۔"

مہندر سنگھ نے پگڑی میں سے لٹکتی ہوئی بالوں کی لٹ کو پکڑ کر دانتوں سے کاٹا اور انگلیوں میں مسل کر نیچے گرا دیا۔

"پتہ نہیں۔ ہماری اپنی فصل رہت ہے اس بار۔ پتہ نہیں۔"

"میں نقشی کے پاس گیا تھا۔ وہ آدھے پر رکھتا ہے۔ تم میرے بیٹے کے دوست ہو۔ تمہارا والا ان بڑا ہے۔"

"رکھ دینا۔ رکھ دینا۔ میں تجھے [illegible] نے کہا۔

"ہاں ہاں میرا بیٹا تمہارا دوست ہے۔"

"ٹھیک ہے۔"

نیاز بیگ نے رسیوں کو ڈھیل دی پھر کھینچ لیا۔ "جب میں [illegible] تمہارے باپ کو ایک بیل دے گیا تھا۔ تمہارا باپ [illegible] مانگتا۔ میں نے کوئی احسان نہیں کیا۔ وہ میرا دوست تھا آخر۔" وہ رسیاں بیلوں کی پیٹھ پر مارنے لگا۔

"یہ نہیں چلیں گے چوہدری۔" مہندر سنگھ ہنسا۔ "انہیں تھوڑی سی دارو پلا۔"

نیاز بیگ غصے میں آ کر بیلوں کو بے تحاشا پیٹنے لگا۔

اگلے کھیت میں ڈھول بج رہا تھا اور کٹائی کی دھن پر کسان درانتیاں چلا رہے تھے۔ دو میراثی ننگے بدن پسینے سے شرابور کھیت کے وسط میں کھڑے ڈھول پیٹ رہے تھے۔ یہ کٹائی کی مخصوص دھن تھی۔ اس سے بجانے والے اور سننے والے کا خون اہل کر بازوؤں میں آ جاتا تھا اور وہ دنیا و مافیہا سے بے خبر درانتی چلاتا جاتا تھا۔ میراثی آنکھیں میچے دو دو گھنٹے تک ڈھول بجاتے رہتے اور کسان اس کی دھن پر مست بغیر سانس لئے ہاتھ چلاتے جاتے۔ یہ ایک اور تین کی تال تھی اور درانتی کے چلاؤ کے لئے مخصوص تھی۔ درانتی تین بار چھوٹے چھوٹے جھٹکے کھاتی اور چوتھی بار بڑا جھٹکا کر ررر...... اور خشک تڑ تڑ کرتے پتلے نازک گندم کے پودوں کا گٹھا ہاتھ میں آ جاتا اور پھر تال کا چکر شروع ہوتا۔ دھم دھم دھم دھا دھم۔ کرر کرر کرر کررر...... کسان پاؤں پر بیٹھے بیٹھے چلتے جاتے اور چھوٹے گٹھے چھوڑتے جاتے۔ پسینہ ان کے ماتھے سے، گردن سے، بغلوں سے ٹپکتا اور زمین میں جذب ہو جاتا۔ بھوکی اور کمزور زمین پسینے سے سیراب ہوتی اور فصل ان کے حوالے کر دیتی۔ چھ ماہ پہلے یہی زمین سیاہ، طاقتور اور گیلی تھی اور ننھے ننھے سبز پودوں کو مضبوطی سے جکڑے ہوئے تھی۔ پانچ ماہ بعد پھر یہ سیاہ اور طاقتور ہو جائے گی لیکن اس وقت

UrduPhoto.com

کسانوں کے بدن سیاہ تھے اور زمین سفید اور کمزور تھی اور اپنے بچوں کو پال کر مالک کے حوالے کر رہی تھی۔

"ور ور ور سوور...... ست ہو گیاہ...... ہلا پوتی کا ہلا لا لا لا......" وہ جانوروں کی بولی بول کر ایک دوسرے کو اکساتے اور دھم دھم دھم دھما دھم...... کر کر کر ر ر...... شریف' محنت کش ہاتھوں میں درانتیوں کی قطار ایک تال پر جھولتی فصل کی جڑوں پر ناچنے لگتی۔

جب سورج سر پہ آیا تو گاؤں کی طرف سے رنگ برنگے کپڑوں کا سیلاب امڈ پڑا۔ بوڑھی جوان بھی عورتیں سر پہ لسی کے مٹکے اور گھی سے تر بتر باجرے کی روٹیاں اٹھائے گھروں سے نکل پڑیں۔ وہ اکیلی دکیلی اور غولوں میں آئیں اور مختلف کھیتوں میں پھیل گئیں۔ ان کے باریک کرتے پسینے سے کمر' پیٹ اور چھاتیوں پر چپکے ہوئے تھے۔ بال اکٹھے کر کے انہوں نے جوڑے باندھ رکھے تھے اور بڑی جوان چال چلتی' لالچی نظروں سے اپنے مردوں کو دیکھتی چلی آ رہی تھیں۔ اپنے اپنے کھیتوں پر پہنچ کر انہوں نے کھانا رکھا اور جگہ جگہ سے چھوٹے چھوٹے گٹھے اٹھا کر جمع کرنے لگیں۔ پھر انہوں نے دھول جمانے والی سوٹیوں سے ماتھے کا پسینہ پونچھا اور درختوں کے ٹھنڈے سائے کی طرف لوٹے۔ کٹائی کرنے والے دکھتے ہوئے گھٹنے اور دکھتے ہوئے پیٹ لے کر اٹھے اور بھوکے جبڑوں کے ساتھ وہاں پر چل پڑے۔

"تو بھی سر چڑھے نہیں رہ سکتی۔" مہندر سنگھ نے دونوں گالوں میں روٹی بھر کر کھاتے ہوئے کلدیپ کور سے کہا۔

"تجھے کیا۔ تجھے تو پورا بھی ملتا ہے۔"

"اور تو اپنی ماں کا گھی سر پر لگاتی ہے؟" وہ چیخا۔

"چپ رہ۔ بھیڑیے۔" مہندر سنگھ نے کہا۔ "سب اپنی اپنی ماں کا گھی کھاتے ہیں۔ ایک دوسرے سے مت لڑو۔" تینوں ہنسنے لگے۔

پھر انہوں نے کٹورے بھر بھر کے لسی کے پیے اور واپس کام میں جا کر جٹ گئے۔

سورج ڈھل رہا تھا تو مغرب کی طرف سے بادل اٹھے اور تیزی سے آسمان پر پھیل گئے۔ کسانوں کی فکر مند نگاہیں آسمان پر جھکنے لگیں۔ ان کی آنکھوں میں دن بھر کی مسرت اور سکون کی بجائے خوف کی جھلک لہرا گئی۔ بیل گاڑیاں بھگا کر وہ گاؤں سے تمام بوریاں اور ترپالیں لائے اور ان سے کٹی ہوئی فصل کو ڈھک دیا۔ جو بچ رہی اسے گاڑیوں پر لاد کر گھر لے چلے۔

"اے قصائی کو دے دو۔ آج یہ نہیں چلتے۔" مہندر سنگھ بیلوں کو چلاتے ہوئے پکارا۔

"نہیں چلتے؟ ان کی ماں......" فقیر دین نے پورے زور سے رسوں کو کھینچا جس سے اس کے بیلوں کی آنکھیں ابل پڑیں۔ پھر ڈھیل دی' وہ آگے کو جھول گئے۔ پھر کھینچا' پھر ڈھیل دی۔ بیلوں کے نتھنے پھڑ پھڑائے' مونچھیں ہوا میں لہرائیں' پیچھے اکڑے اور وہ ایک جھٹکے کے ساتھ دوڑ پڑے۔

UrduPhoto.com

''الا لا لا لاہو'' فقیر دین برابر پہنچ کر للکارا۔ مہندر سنگھ نے بھی اسی آواز میں جواب دیا اور بیلوں کو ڈھیلا چھوڑ دیا۔ کچی سڑک پر دونوں کی گاڑیاں بھاگنے لگیں۔ بغیر اعلان کے دوڑ شروع ہو گئی۔ دیہاتوں میں ایسے مقابلے روز مرہ کی بات تھی اور ان میں بہت کم باقاعدہ اعلان جنگ کی ضرورت سمجھی جاتی تھی۔ اب دونوں طرف سے ''الا لا لاہ.....'' کی مخصوص رٹ اُٹھ رہی تھی۔ یہ اونچی' کرخت بھیڑیوں کی سی آواز تھی جو دونوں فریق جوش اور غصے میں آ کر نکال رہے تھے اور چھڑیاں اور رسیاں اور کیہوں کے تاز بیلوں کی پسلیوں پر مارتے جا رہے تھے۔ راستے میں جاتے ہوئے کسان انہیں دیکھتے اور رستہ چھوڑ دیتے۔ جوشیلے لڑکے ایسی ہی آوازیں نکال کر ان کی ہمت بڑھاتے۔ گاڑیاں کچی سڑک کے گڑھوں اور پتھروں پر اچھلتی' بیٹھتی' چرچراتی' گرد و غبار کا طوفان اٹھاتی ہوئی بھاگ رہی تھیں اور اوپر ہر دو فریق کے بہی خواہ گاڑی کے ڈنڈوں سے لپٹے ہنکارے مار رہے تھے۔

''اوپر برکھا آ رہی ہے اور لونڈوں کو مستی سوجھی ہے۔'' جلدی سے رستہ چھوڑتا ہوا ایک بڈھا کسان بھووں میں جھلایا۔ گاڑیاں کھڑ کھڑاتی ہوئی اس کے پاس سے نکل گئیں اور وہ سر سے پاؤں تک گرد میں اٹ گیا۔

جوہڑ کے کنارے پہنچ کر مہندر سنگھ نے گاڑی ٹھہرائی اور مڑ کر تہبند نکال دیا۔

''الا لا لاہو۔ واہگرو.....'' فتح اور غرور کے نشے میں وہ فقیر دین کے رستے میں کھڑا ہو کر ناچنے لگا۔ فقیر دین نے کنچی آنکھیں سکیڑ کر دیکھا اور نفرت سے اس کی طرف تھوکتا ہوا نکل گیا۔ کلدیپ کور اندر سے نکلی اور شرم سے لال ہو کر رو [illegible]

رات بھر وہ جاگتے اور فصلوں کے گرد پھرتے رہے۔ پچھلی رات مطلع صاف اور پرسکون ہو گیا۔ طوفان خاموشی سے گزر چکا تھا۔ کسان اگلا دن شروع کرنے سے پہلے دو گھڑی آرام کرنے کی خاطر اپنے اپنے گھروں کو لوٹ گئے۔ سویرے ایک اور طوفان ان کی راہ دیکھ رہا تھا۔

سورج ہاتھ بھر بھی اوپر نہیں آیا تھا لیکن دن میں دوپہر کی تپش آ چکی تھی۔ صبح کی تازہ' سبک ہوا کے ساتھ دھوپ کچی منڈیوں اور بھورے وسیع کھیتوں پر پھیل چکی تھی۔ میالے رنگ کا غبار جو تین روز تک گاؤں پر منڈلاتا رہا تھا بادل اور ہوا کے گزرنے کے ساتھ چھٹ چکا تھا۔

فضا پہاڑی جھرنے کی طرح کھنکتی ہوئی شفاف تھی اور آخر مئی کے سفیدی مائل نیلے آسمان پر پُر شکم پرندے آزادی سے اڑ رہے تھے۔ دھوپ بڑی آہستگی سے گلیوں میں داخل ہوئی اور بیلوں کی گھنٹیاں بج اٹھیں۔ انہیں کھیتوں کو لے جاتے ہوئے کسان ہنس ہنس کر باتیں کرنے لگے۔ گھنٹیوں کی کھنک اور کسانوں کی آوازیں صبح کی دھوپ کی طرح گرم' شفاف اور جاندار تھیں۔ نکھری نہائی ہوئی فضا میں آک کی سفید روئی کی ''بڑھیاں'' اڑ رہی تھیں اور چند بچے شور مچاتے ہوئے ان کے پیچھے بھاگ رہے تھے۔

جوہڑ کے کنارے پہنچ کر ساری آوازیں یک بیک رک گئیں۔ صرف بچوں کے چلانے کا شور دور سے آتا رہا۔ نیاز بیگ باہر نکلا اور گھبرا کر واپس گھر میں گھس گیا۔ بھوسے کے ڈھیر میں چہرہ گاڑ کر وہ عورت سے بولا:

''کواڑ بند کردو۔ تالا لگادو۔ چھپر پر پڑا ہے۔ کسی کو مت بتانا۔ یہاں پر کوئی نہیں ہے۔ کوئی نہیں ہے۔ سنا؟ جاؤ.....'' پسینہ اس کی سیاہ گردن پر دھاریاں بناتا ہوا گندے کالر میں جذب ہو رہا تھا۔

نعیم باہر نکلا۔ شیشم کے بڑے پیڑ کے نیچے دس بارہ فوجی ٹرک اور لاریاں کھڑی تھیں۔ تین گورے سارجنٹ اور دو گورے فوجی افسر کسانوں اور بیلوں کے ہجوم کے سرے پر حرکت کر رہے تھے۔ ان کے پاس مہندر سنگھ کی بیل گاڑی دونوں ڈنڈے آسمان کی طرف اٹھائے کھلی کھڑی تھی۔ پولیس کے سپاہی ہر طرف سے کسانوں کو گھیر کر لا رہے تھے۔

ایک انگریز سارجنٹ نے شستہ اردو اور بھاری، کرخت فوجی لہجے میں ہجوم کو مخاطب کیا۔ ''اپنے ملک، اپنی حکومت کی حفاظت کرنے کا فرض ہر فرد پر عائد ہوتا ہے۔ جنگ تمہارے ملک اور تمہاری حکومت کو تباہ کرنے پر تلی ہوئی ہے۔''

ہجوم پر سناٹا طاری تھا۔ کبھی کوئی بیل سینگ جھٹک کر پھنکارتا اور اس کی گھنٹی کی آواز ایک لمحے کے لئے سکوت کو توڑ دیتی۔ سارجنٹ نے اپنے زرد چہرے پر آہستگی سے ہاتھ پھیرا اور تن کر کھڑا ہو گیا۔

''جنگ جیتنے کے لئے ہمیں جوانوں کی ضرورت ہے۔ جس کے پاس زیادہ جوان ہوں گے وہ حکومت جنگ جیتے گی۔ ہمارے ملک میں لاکھوں جوان ہیں۔'' اس نے رک کر ہاتھ پھیلایا۔ ''ان کی مدد سے ہم ضرور فتح حاصل کریں گے۔ [illegible] کی ذمہ دار حکومت ہوگی۔ جنگ ختم ہونے پر جوان واپس آجائیں گے۔'' ''واپس آجائیں گے.....'' بڈھا رحمت طنز سے ہنسا۔ ''جنگ میں اب خون ہونا بند ہو گیا ہے۔ ہم تماشے پر جا رہے ہیں ایں؟''

سارجنٹ کے ہونٹ کانپے۔ ''ہم بوڑھوں کو نہیں لے جائیں گے۔ جوان اپنا نام دیں۔''

مجمعے میں سے شہد کی مکھیوں کی سی بھنبھناہٹ اٹھی۔ درمیان میں دو لڑکے باتیں کرنے لگے۔

''لڑائی کہاں ہو رہی ہے؟''

''پتہ نہیں۔''

''لڑائی ہو کہاں رہی ہے۔ ہاں۔''

اگلی صف میں کھڑے ہوئے مہندر سنگھ نے سارجنٹ کو مخاطب کیا۔ ''ہاں لڑائی کہاں ہو رہی ہے؟''

بھنبھناہٹ تیز ہو گئی۔

''خاموش۔'' سارجنٹ نے ہاتھ پھیلایا۔ ''جنگ انگلستان کو دھمکی دے رہی ہے۔ انگلستان کو دھمکی دے رہی ہے۔ میرا مطلب ہے آپ کی حکومت۔ حکومت برطانیہ کو بچانے کے لئے آپ کی ضرورت ہے۔ جوان اپنا نام دیں۔''

''ہم کٹائی پر جا رہے ہیں۔'' بیچ میں سے آواز آئی۔

''کٹائی ختم کر کے جائیں گے۔''

"وہ فصل باہر پڑی ہے ابھی۔" مہندر سنگھ اگلی صف میں سے بولا۔

سارجنٹ نے ایک نظر مڑ کر انگریز فوجیوں کو دیکھا' پھر مضبوط آواز میں بولا: "ہمارے پاس وقت نہیں ہے۔ ہمیں سارے ضلع میں جانا ہے۔ اپنے نام دو۔"

ہجوم میں جنبش پیدا ہوئی۔ کسان اپنے اپنے بیلوں کے ساتھ جسم رگڑنے لگے۔ مختلف جگہوں سے چند دبی دبی آوازیں آئیں۔ "ہم کیا کھائیں گے؟" "فصل کو کیڑے اٹھائیں گے۔ ہیں؟" "ہم نہیں جائیں گے۔"

"سارے برس ہم نے سوروں کے لئے محنت کی؟"

"دیکھو۔ ہمارے ہاتھ دیکھو۔" پیچھے کھڑے ہوئے ایک کسان نے سیاہ' خشک تڑ کا ہوا ہاتھ پھیلایا۔ آس پاس کھڑے ہوئے لوگوں نے اس کا کانٹے دار' پرانے سوکھے ہوئے چمڑے والا ہاتھ دیکھا لیکن سارجنٹ مڑ کر فوجیوں کو دیکھ رہا تھا۔

لمبے' پتلے چہرے والے فوجی افسر نے جیب سے کاغذوں کا ایک پلندہ نکالا' الٹ پلٹ کر دیکھا اور اپنے ساتھی کو پکڑا دیا۔ پھر وہ تیزی سے اچھل کر رکی ہوئی گاڑی پر جا چڑھا اور وزن قائم رکھنے کے لئے ایک بازو پھیلا کر تیز لہجے میں بولا۔

"[illegible] فصلیں اب تم اس سے کاٹو گے۔ اور میدان جنگ میں کاٹو گے۔" یہ کہہ کر اس نے سنگین ہوا میں لہرائی۔ چمکتے [illegible] کی طرح سنگین گاڑی کے فرش پر چھپکلی ہو جا کر لکڑی میں گڑ گئی۔

"سپاہیوں کا حکم دو جوانوں کو پیش کریں۔" اس نے سارجنٹ سے کہا۔

سنگین لگی رائفلوں کے ساتھ جوانوں کو ہانکا جانے لگا۔ بعض کسانوں کو بیلوں میں رائفلوں کے دستے اور سنگینیں چبھو چبھو کر بیلوں سے علیحدہ کیا گیا لیکن وہ بچوں کی طرح ان کی گردنوں اور سینگوں سے لپٹے ہوئے دبی دبی زبان میں گالیاں دیتے رہے۔ نعیم خاموشی سے چلتا سارجنٹ کے پاس جا کھڑا ہوا۔

"میرا نام لکھو۔" اس نے انگریزی میں کہا۔

سارجنٹ نے اچنبھے سے اسے دیکھا۔ "تم تعلیم یافتہ ہو؟"

"میں نے کلکتہ سے سینئر کیمبرج کیا ہے۔"

"اور اب کہاں کو جا رہے ہو؟"

"ہاں۔"

"جاؤ۔" سارجنٹ کاغذات پر جھک گیا۔

"میں محاذ پر جاؤں گا۔"

سارجنٹ نے ہاتھ کے اشارے سے اسے جانے کو کہا۔ "تم اس کے لئے موزوں نہیں ہو۔ جاؤ۔" پتلے

چہرے والا افسر قریب آ کھڑا ہوا۔ نعیم نے غیر یقینی نظروں سے اس کی طرف دیکھا اور ایک شدید اندرونی خواہش کے زیر اثر بولا۔ ''میں سواری کر سکتا ہوں۔ رائفل چلا سکتا ہوں۔ ان سب سے بہتر لڑ سکتا ہوں۔''

''ٹھہرو۔ بھرتی ختم ہونے دو۔'' افسر نے آہستہ سے کہا۔

وہ وہیں کھڑا سروں کے اوپر اوپر مغرب کی طرف دیکھنے لگا جہاں دھوپ میں چمکتے ہوئے کھیت تھے اور گیہوں کے بھاری خوشے شرابیوں کی طرح ہوا میں جھوم رہے تھے۔ جگہ جگہ کٹی ہوئی فصل کے انبار بڑے بڑے مردہ پکھوؤں کی طرح سنسان کھیتوں میں پڑے تھے اور ایک اکلوتی سیاہ گھوڑی ان کے درمیان پھر رہی تھی۔ آسمان پر چیلیں زبانیں نکالے چیخ رہی تھیں اور دوپہر کی گرم ہوا کھیتوں میں' کھلیانوں میں' فصلوں میں اور کسانوں کے پسینے کی معطر خشک نمیالی زمینوں میں سرسرا رہی تھی۔ نعیم کا اپنا کھیت اس کی پشت پر تھا۔ وہ اسے دیکھنے کے لیے مڑا' پھر رک گیا اور سوئی سوئی نظروں سے اچھلتے کودتے ہوئے' دھکم پیل کرتے اور گالیاں دیتے پسینے اور گرد میں اٹے ہوئے ہجوم کو دیکھنے لگا۔ وہ گھنٹے کی مسلسل کشمکش کے بعد صرف دو کم عمر لڑکے جن کے ماں باپ مر چکے تھے' بھرتی کیے جا سکے۔ پتلے چہرے والا فوجی افسر جو نمایاں طور پر غصے میں تھا' نعیم کی طرف مڑا۔

''ہمیں تعلیم یافتہ لوگوں کی نہیں' کسانوں کی ضرورت ہے۔ بہتر ہے تم یہیں ٹھہرو یا محکمہ تعلیم میں نوکری کر لو۔''

''میں کسی محکمہ میں نوکری نہیں کرنا چاہتا۔ میں کسان ہوں۔'' نعیم نے کہا۔

UrduPhoto.com

افسر ... آیا ... ایک ہندوستانی حوالدار نے اس کا نام' والدین' مذہب' پیشہ' عمر' قد اور شناختی نشان درج کیے اور کاغذات اس کے ہاتھ میں تھما کر دوسرے دو لڑکوں کے ساتھ کھڑا کر دیا۔

وہ رات ان تینوں نے فوجی ٹرک میں گزاری۔ رات گئے تک وہ بیٹھے آہستہ آہستہ باتیں کرتے رہے۔ پھر نو عمری کی نیند ان پر غالب آ گئی اور وہ ایک ایک کر کے سو گئے۔ اگلی صبح انگریز افسر جو راتوں رات گاڑی لے کر کہیں چلا گیا تھا' لوٹا۔ اس کے ساتھ روشن آغا تھے۔ وہ فوجی گاڑی کی اگلی سیٹ سے اتر کر حویلی تک آئے اور وہیں کھڑے کھڑے جوانوں کو اکٹھا کرنے کو آدمی دوڑا دیے۔ ان کی آواز پر دیکھتے دیکھتے گاؤں کے تمام نوجوان' بوڑھے اور بچے حویلی کے میدان میں جمع ہو گئے۔ ایک مدت کے بعد روشن آغا کی شکل دیکھ کر انہوں نے اپنی مسرور کن' وفادار آنکھوں سے خوش آمدید کہا اور آ کر ادب سے کھڑے ہو گئے۔ روشن آغا نے ایک انتہائی ہوتی ہوئی سرپرستانہ نظر ان پر ڈالی اور کرسی پر چڑھ کر کھڑے ہو گئے۔ پھر ایک مختصر سی تقریر کے دوران انہوں نے ہندوستانی کسانوں کی بہادری' حکومت برطانیہ سے ان کی وفاداری اور جنگ کی ہولناکیوں وغیرہ کا ذکر کیا۔ اس تمام دوران میں سارے فوجی افسر سینے پر ہاتھ باندھے بڑی متانت اور لاتعلقی سے کھڑے رہے۔ آخر میں روشن آغا نے جنگ پر جانے والوں کے خاندانوں کی دیکھ بھال کا ذاتی طور پر ذمہ لیتے ہوئے سرسری لیکن فیصلہ کن لہجے میں بھرتی کے لیے پیش ہونے کا حکم دیا۔ اب کسی کو دم مارنے کی مجال نہ تھی۔ فوجیوں نے اپنا کام شروع کیا۔ کسانوں کے مجمع میں

ایک خاموش ہلچل پیدا ہوئی لیکن وہ ایک ایک کر کے ننگے بدن ڈاکٹر کے آگے سے گزرتے رہے۔ ڈاکٹر نے چند ایک کو چھو کر دیکھا' باقی کو سر کے ہلکے سے اشارے کے ساتھ سارجنٹ کے حوالے کر دیا جو ان کے کاغذات تیار کر رہا تھا۔ تین گھنٹے کے اندر اندر گاؤں کے زیادہ تر نوجوان جو تعداد میں چالیس تھے' بھرتی کر لئے گئے۔

لال دین سے حقہ رکھوانے کے لئے ایک سپاہی اس کی طرف بڑھا۔

''جاؤ.....'' لال حقے کو بازوؤں میں چھپا کر چیخا۔ ''جا میں نہیں دیتا۔ مجھے مار دے' خون کر دے' پر اسے ہاتھ مت لگا۔ میں اس سے تیرا سر توڑ دوں گا۔''

سارجنٹ نے ہاتھ کے اشارے سے سپاہی کو روکا اور اس طرح ایک حقہ جوانوں کے ساتھ چلا گیا۔ سب کو ٹرکوں اور لاریوں میں بھر لیا گیا۔ روشن آغا تھوڑی دیر رک کر اسی فوجی گاڑی میں واپس لوٹ گئے۔ گاؤں کی عورتیں اپنے بیٹوں' خاوندوں اور محبوبوں کو جنگ پہ جاتے دیکھ کر اونچی آواز سے رونے لگیں۔ بوڑھے آنکھوں پر ہاتھ کا سایہ کر کے امیر اور ویران کھیتوں کو دیکھتے رہے۔

نیاز بیگ اگلی صبح بھوسے والے کمرے سے نکلا۔ کم خوابی کی وجہ سے اس کی آنکھوں کا خلا شدت اختیار کر گیا تھا۔

''نعیم چلا گیا؟'' .... بیٹھی ہوئی عورت نے خاموشی سے اسے دیکھا اور سر جھکا کر ... کریدنے لگی۔ اس کی آنکھیں زرد اور خشک تھیں۔ نیاز بیگ جھک کر چلتا ہوا دیوار کے پاس گیا اور ایڑیاں اٹھا کر اگلے مکان میں جھانکنے لگا۔

''حسین چلا گیا؟''

''ہاں۔'' دیوار کے پرلی طرف احمد دین نے جواب دیا۔

''اور کون گیا؟'' دوسری طرف سے کوئی جواب نہ آیا۔

''فصل پر جا رہے ہو؟'' وہ دوبارہ آ پکا۔ اس طرف خاموشی رہی۔ کچھ دیر تک وہ صحن کے وسط میں کانپتی ہوئی ٹانگوں پر کھڑا رہا۔ دو راتوں میں وہ بہت بوڑھا ہو گیا تھا۔ پھر وہ چلم پر تمبا کو اور گڑ رکھ کر چولہے کے پاس گیا۔

''آگ ہے؟''

''نہیں۔'' عورت اس کے غصے کا انتظار کرنے لگی۔

اس نے خاموشی سے چلم زمین پر رکھ دی اور کونے میں جا کر درانتی اور رسہ اٹھایا۔ جھکے ہوئے جسم اور کمزور چال سے صحن پار کرتے ہوئے اسے اس کی بیوی نے دیکھا اور رنج اور رحم سے خوف زدہ ہو گئی۔

''بوڑھے کے اب کتنے دن ہیں۔'' اس نے سوچا۔

نیاز بیگ نے رسہ کندھے پر پھینکا اور درانتی کو پگڑی میں اڑسنے لگا۔ دیر تک وہ اعصابی انگلیوں کے

UrduPhoto.com

ساتھ بگڑی رسے اور درانتی کے ساتھ الجھتا اور بھوؤں میں جھلاتا رہا۔ پھر اس نے جھک کر نعیم کی درانتی اور رسہ اٹھایا اور دروازے میں بیٹھے ہوئے چھوٹے لڑکے کے کندھے پر رکھا۔ ''آؤ......'' باہر نکلتے ہوئے وہ بولا۔

بچہ رسے کو سنبھالتا ہوا کود کر اٹھا اور خوش ہو کر چہکا۔

''میں کٹائی کر لیتا ہوں بابا۔ کل میں نے دوسرے فصل کاٹی تھی۔''

دروازے کے پاس وہ بھینس کے پھولے ہوئے تھنوں کو دیکھ کر رک گیا۔

''اسے دوہا نہیں؟'' تھنوں کے نیچے ہاتھ پھیلاتے ہوئے اس نے پوچھا۔ بھینس ڈکرائی اور سفید گاڑھے دودھ کے چند قطرے اس کی ہتھیلی پر گر پڑے۔ چھوٹے لڑکے نے سہم کر اسے دیکھا۔ (یہ نیاز بیگ کے گھر میں بہت بڑا جرم تھا۔ اس لاپروائی پر وہ دو دو فٹ اچھلا کرتا اور کہتا ''جانور کو عذاب دے کر تم کبھی سکھی نہیں رہ سکتے۔ تمہاری گود کے بچے بھی مر جائیں گے اور تمہاری چھاتیوں سے دودھ ٹپکے گا' کتیو......'') عورت ہاتھ روک کر پھیلی ہوئی آنکھوں سے اسے دیکھنے لگی۔

اس نے گندی ہتھیلیوں میں دودھ مل کر سر کے بالوں سے پونچھا۔

''بھینس کا دودھ چھینک رہی ہے۔'' پھر اس نے بیمار آواز میں کہا اور باہر نکل گیا۔ لڑکا فصل کاٹنے کی خوشی میں اس کے پیچھے پیچھے دوڑ رہا تھا اور مسلسل باتیں کر رہا تھا۔ دفعتاً بڑی عورت جو دو روز سے خاموش بیٹھی تھی' پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

دھوپ کھیتوں اور کچے مکانوں کی مٹیوں پر پھیل گئی تھی اور گلیوں میں سے بیلوں کی گھنٹیوں کی اکا دکا آوازیں آ رہی تھیں۔

UrduPhoto.com

(۸)

نمبر 129 بلوچی' ڈیوک آف کناٹس اون' فیروز پور بریگیڈ' لاہور ڈویژن۔ رجمنٹ دو ماہ تک ہیڈ کوارٹرز پر رکی رہی۔ اس عرصے میں رنگروٹوں کو انتہائی سخت ٹریننگ سے گزرنا پڑا۔ اٹھارہ گھنٹے جو وہ جاگتے ان میں سے بارہ گھنٹے مشقیں (Exercises) کرتے' پریڈ' دوڑ اور اسلحہ کا استعمال سیکھتے' چھ گھنٹوں میں کھانا کھاتے' کپڑے سیتے' جوتے اور بوٹ پالش کرتے اور گپ مارتے۔

درختوں' کبوتروں اور کھیتوں کی ہوا کی طرح آزاد' اپنی مرضی سے کام کرنے والے کسانوں پر یہ منظم' مشینی عمل بہت بھاری ہو گیا۔ کھیتوں اور باغوں میں وہ اس سے زیادہ سخت کام کرتے تھے لیکن اب بیلوں اور گھوڑوں کی بجائے رائفل اور خوراک و بارود کا تھیلا تھا اور جہاں وہ اپنی خفیف ترین مرضی کے مطابق گاؤں کی کسی بھی گلی' کسی بھی کونے پر مڑ سکتے تھے' رک کر باتیں کر سکتے تھے اب خاص ہدایات کے تحت دائیں اور بائیں مڑتے اور

حکم ملنے پر رکنا چلنا پڑتا تھا۔ محنت کی اس پابندی سے ان کے جسم تھکاوٹ سے ٹوٹ گئے اور چاق و چوبند ذہن بھی اور سست ہو گئے۔

اگست کے پہلے دن نعیم پریڈ پر سے لوٹا۔ آسمان پر ساون کے سیاہ گھنے بادل گرج گرج کر چمک رہے تھے۔ علی پور کا عبداللہ' جو ساری پلٹن میں نعیم کا واحد دوست تھا' بارک کے کونے میں بیٹھا کچھ سی رہا تھا۔ مغربی پنجاب کے چار سپاہی ایک دوسرے کی طرف پیٹھ کیے وردیاں اتار رہے تھے۔ اس بارک میں یہی چھ سپاہی تھے۔

''تم چاند ماری کے بعد کہاں غائب ہو گئے؟'' نعیم نے عبداللہ سے پوچھا۔

''میں آوارہ گردی نہیں کرتا۔ سیدھا گھر آتا ہوں۔''

''گھر......'' نعیم نے تمسخر سے دہرایا۔ بندھے ہوئے بستر کو بوٹ سے دھکیل کر اس نے دیوار کے ساتھ لگایا اور اس پر بیٹھ کر آنکھیں بند کر لیں۔ وہ تھک گیا تھا۔ گھسیٹ کر ٹوپی اتارنے کے بعد اس نے اس کے ساتھ چہرے اور گردن کا پسینہ پونچھا اور [illegible] فرش پر پھینک دیا۔ پھر اس نے آنکھیں کھولیں۔ بادل آسمان پر بہت نیچے جھک آئے تھے۔

''آج تم کسی نہ کسی کو مار دیتے۔'' اس نے بوٹ پٹیاں اتارتے ہوئے کہا۔

باہر بارش شروع ہو چکی تھی۔ دوسرے کونے میں ایک پنجابی سپاہی ساون کا کوئی گیت گانے لگا۔

''[illegible]'' نعیم نے پوچھا۔ عبداللہ [illegible] کوئی [illegible] پر جھکا رہا۔

''بعض لوگوں کے سر میں بیل کا دماغ ہوتا ہے۔''

''تم باؤلے ہو گئے ہو۔'' عبداللہ آنکھیں نکال کر چیخا۔

نعیم ہونٹوں میں ہنسا۔ وردی اتار کر اس نے گول بستر بغل کے نیچے رکھا اور لیٹ گیا۔ عبداللہ نے آخری ٹانکا لگا کر دھاگا توڑا اور غور سے اسے دیکھ کر بولا۔

''پارسال انہی دنوں میں میں نے ایک مچھلی پکڑی تھی۔ بڑی خوب صورت......''

''پھر......؟''

''مجھے یاد ہے۔ میں سارا دن بیٹھا دھوپ میں جلتا رہا تھا مگر ایک پھوے کے سوا کچھ ہاتھ نہ آیا تھا۔ شام کے وقت بادل آ گئے' خوب بارش ہوئی اور ایک مچھلی بھی لگ گئی۔ چھوٹی سی' بس یہ انگلی دیکھو لو۔ پر اتنی خوب صورت مچھلی میں نے آج تک نہیں دیکھی۔ اس کے جسم پر ہزار رنگ کے دانے تھے اور ہیروں کی طرح چمک رہے تھے۔ میں اسے کٹورے میں ڈال کر گھر لے آیا اور ناند میں پانی بھر کر اسے چھوڑ دیا۔''

بارش موسلا دھار ہو رہی تھی۔ چاروں پنجابی سپاہی ننگے بدن باہر کھڑے نہا رہے تھے۔ اسی طرح سب بارکوں کے آگے ننگے' گندمی اور سیاہ جسم بھیگتے' کودتے اور شور مچاتے ہوئے دکھائی دے رہے تھے۔ جو نہیں نہا رہے تھے وہ برآمدوں میں کھڑے تمباکو پی رہے تھے اور گپ مار رہے تھے۔ بادل فیروز پور چھاؤنی پر بہت نیچے جھک

آئے تھے اور کمروں میں اندھیرا بڑھتا جا رہا تھا۔

''کیا کہہ رہے تھے؟'' نعیم نے پوچھا۔

''آج بالکل ویسا ایک پتھر میری تھوڑی کے آگے پڑا تھا۔ اس پر ہزار رنگ کے دانے تھے اور عین عین اسی شکل کا تھا۔ میں نے اتنے عرصے سے مچھلی نہیں پکڑی۔ میرا دل چاہا اسے پکڑ لوں۔ یقین کرو میرا ارادہ نہیں تھا'' وہ رُکا۔ ''لیکن مجھے محسوس ہوا کہ وہ مچھلی ہے اور بھاگ جائے گی۔ میں نے اس پر فائر کر دیا۔ میرا ارادہ نہیں تھا۔ خدا کی قسم میرا کوئی خیال نہ تھا۔ پر اس وقت میری کچھ سمجھ میں نہ آیا۔ بس پتہ نہیں۔''

بارش کا زور کم پڑ گیا تھا اور پارک میں اجالا بڑھنے لگا۔

''مضحکہ خیز!'' نعیم نے کندھے اچکائے۔ ''اور اس مچھلی کا کیا ہوا؟''

''وہاں کسی نے بیل لا کر باندھ دیئے۔ شاید وہ کھا گئے۔''

نعیم نے ہاتھ چوڑا کر کے عبداللہ کے کندھے پر مارا جس سے اس کا سارا بدن ہل گیا۔

''دانت مت نکالو۔ تم نے کبھی مچھلیاں نہیں پکڑیں۔ تم نہیں سمجھ سکتے۔ بعض لوگوں میں بیل کا دل بھی ہوتا ہے۔'' اس نے ٹرنک کھول کر پالش کا سامان نکالا اور بوٹ چمکانے لگا۔ برآمدے کے باہر مینہ تھم چکا تھا لیکن سپاہی ابھی تک ننگے بدن دوڑتے ہوئے خوش فعلیوں میں مصروف تھے۔ ان کے جسم محنت کی وجہ سے پڑ گئے تھے اور رگیں ابھر آئی تھیں [illegible]

''لیکن ایک بات میں تمہیں بتاؤں۔'' عبداللہ ہاتھ روک کر بولا۔

''بیلوں کا دل بالکل آدمیوں کی طرح ہوتا ہے۔''

''کیسے؟''

''وہ سب کچھ سنتے ہیں اور سمجھتے ہیں۔ روتے بھی ہیں۔'' نعیم گنگناتا ہوا ہنسا۔

''تم یقین نہیں کرتے؟ تم نے بیل بھی دیکھے ہیں؟ میں تو بیلوں میں پیدا ہوا اور بیلوں میں پلا......''

نعیم کو بے دھیانی سے گنگناتے دیکھ کر وہ زور زور سے برش رگڑنے لگا۔

''گھوڑوں کا مجھے پتہ ہے۔ وہ سب سمجھتے ہیں۔'' اچانک نعیم نے کہا۔

''ہاں گھوڑے بھی سمجھتے ہیں اور بیل بھی۔ میں تمہیں بتاتا ہوں جب میری پہلی بیوی مری تو لاٹھا' جو ہمارے گھر میں ہی پیدا ہوا تھا' دو روز تک بھوکا رہا۔ میری بیوی اسے چارہ ڈالا کرتی تھی۔ میں باہر گیا تو وہ بھی پیچھے پیچھے آ گیا۔ آم کے پیڑ کے نیچے میں گھٹنوں میں سر دے کر بیٹھ گیا تو وہ میری گردن چاٹنے لگا۔ پھر قریب ہی بیٹھ گیا اور میرے کندھے پر سر رکھ کر سانس لینے لگا۔ بڑی دیر بعد میں نے دیکھا تو اس کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ ایک آم توڑ کر دیا تو نہیں کھایا' بس سر ہلا دیا۔ پھر آدھا میں نے کھایا تو اس نے بھی چکھ لیا۔''

کھانے کی پہلی گھنٹی ہو چکی تھی اور نہانے والے اندر آ کر کپڑے پہن رہے تھے۔

''گھوڑوں کے متعلق مجھے پتہ ہے۔'' نعیم نے کہا۔

''ہاں۔ گھوڑے بھی اور بیل بھی۔''

نعیم نے اٹھ کر تام چینی کا جگ اور تھالی ٹرنک میں سے نکالی اور تولیے کے ساتھ انہیں صاف کیا۔ ''چلو لنگر سجنو۔'' ایک پنجابی سپاہی نے تھالی اور جگ بجاتے ہوئے ان دونوں سے کہا۔

''چلو۔''

باہر آ کر عبداللہ نے اونچے ہوتے ہوئے بادلوں اور دھلی دھلائی ہوئی فضا کو دیکھا۔

''آج تو آم کھانے کا دن ہے۔ پتہ نہیں یہ ہمیں آم کیوں نہیں دیتے۔'' اس نے کہا۔

ہر طرف سے جوان برتن ہاتھوں میں لئے ایک ہی سمت میں جا رہے تھے۔ کھانے کے ایک گھنٹہ بعد وہ پھر پریڈ کے لئے تیار ہو رہے تھے۔

''یہ بکلس لگا دو بھائی۔'' عبداللہ نے دونوں ہاتھوں سے تھیلے کو پیچھے پر تھامتے ہوئے کہا ''میں سارجنٹ کو بتاؤں گا۔''

''کیوں؟''

''تم اپنی 'کٹ' بھی نہیں باندھ سکتے۔''

عبداللہ [illegible] ہو رہا۔

پھر جب وہ 'کٹ' باندھ چکا تو اس نے تھکی ہوئی آواز میں پوچھا۔

''جنگ کب شروع ہوگی نعیم؟''

''تمہیں مرنے کی جلدی ہے؟''

''میں اس پریڈ سے عاجز آ گیا ہوں۔ جنگ جہاں ہو وہاں پر آم تو ہوں گے۔ آموں کے درخت ہی ہوں گے۔ شاید مچھلیاں بھی ہوں۔''

''وہاں موت بھی ہوتی ہے۔''

''ٹھیک ہے' لوگ مریں گے تو سہی۔ یہاں تو ہمیں بندوق ہے اور گولیاں ہیں اور...... قیدیوں کی طرح بند پڑے ہیں۔ ایک نہ ایک دن میں کسی کو گولی مار دوں گا۔''

''کیا کہا؟'' نعیم نے یکلخت پوچھا۔ عبداللہ نے سراسیمگی سے اسے دیکھا اور ہنسنے لگا۔

باہر آ کر اس نے نعیم کو کہنی پر چھوا۔ ''تم یقین نہ کرو چاہے' پر میں بندوق ہاتھ میں لیتا ہوں تو مجھے مزہ آ جاتا ہے۔ میرا دل کرتا ہے کسی کا خون کروں۔ تبھی آج سویرے میں نے فیر کیا تھا۔ پر پتھروں میں خون کہاں سے آیا۔''

''فکر نہ کرو۔ جلد ہی موقع ملے گا۔'' نعیم نے کہا۔

UrduPhoto.com

عبداللہ کھسیانی، کھوکھلی آواز سے ہنسا۔

چار اگست 1914ء کو جنگ کا اعلان کیا گیا۔ پانچ دن کے بعد بریگیڈ کو کوچ کا حکم ملا۔ تمام صفوں میں خوشی کی لہر دوڑ گئی۔ انہوں نے رگڑ رگڑ کر بوٹ پالش کیے، رائفل کی نالی اور دستہ چمکایا، وردی کے بٹنوں پر سوڈا گھسا، بالوں میں تیل اور آنکھوں میں سرمہ لگایا۔ جو تعلیم یافتہ تھے انہوں نے لمبے لمبے خط اپنے گھروں کو لکھے اور دوسروں کو لکھ کر دیے۔ اتنے دنوں کی خشک بھاری ڈیوٹی کے بعد جب اصل جنگ کا لفظ چاروں طرف پھیلا تو اداس اور اکتائے ہوئے ذہن اور تھکن سے چور اعضاء خون کی تیزی سے سنسنانے لگے۔

بارک نمبر 6 میں وہ تیار ہو رہے تھے۔

''تم گھر خط نہیں لکھو گے؟'' نعیم نے پوچھا۔

''نہیں......'' عبداللہ کے ہاتھ مشین کی طرح رائفل کے پرزے پر چل رہے تھے۔ وہ اسے تیل دے کر رواں کر رہا تھا۔ پنجابی سپاہی اپنا اپنا سامان باندھ رہے تھے۔ بارک میں صرف رائفل کے پرزے کی ٹھک ٹھک اور ٹرنکوں کے گھسیٹنے کی آوازیں تھیں اور لالٹین کی روشنی میں انسانی جسموں کے چھوٹے بڑے سائے دیوار پر ناچ رہے تھے۔ باہر شام کی تاریکی تیزی سے پھیل رہی تھی۔ ایک بھاری دھماکے سے پھٹنے والی خاموشی کمرے کی فضا پر طاری تھی۔ ان [illegible] ہر ایک [illegible] سب [illegible] یا ایک ایک دوسرے پر ٹوٹ پڑیں گے یا پھر...... پتہ نہیں، لیکن کچھ ہوگا ضرور جس کے لئے وہ خاموشی اور پھرتی سے تیار ہو رہے تھے۔ ان کی طبیعت ہلکی پھلکی تھی اور ہر ایک یہ سوچ رہا تھا کہ اس کو کوئی بات کرنی چاہیے۔ لیکن اتنے دنوں کی اداس، غبار کی سی یکساں زندگی کے خاتمے اور جنگ کی سنسنی سے عارضی طور پر ان کی زبانیں گنگ ہو گئی تھیں اور دماغوں میں خون بھر گیا تھا۔

''میں خط نہیں لکھوں گا۔'' رائفل پر ہاتھ روک کر عبداللہ خوش دلی سے بولا۔

''کیوں؟''

''اگر میں مارا گیا تو خط کا کیا فائدہ؟ تین سو خط بھی میری بیوی کے پاس ہوئے تو بھی وہ دوسری شادی کرے گی۔ خط کسی کو کچھ نہیں کہتے۔''

''اگر پنجاب میں کوئی ایسا کرے تو ہمارے بھائی اسے قتل کر دیتے ہیں۔'' ایک پنجابی سپاہی نے کہا۔

''پنجاب میں جنگلی رہتے ہیں۔''

بات کرنے والا پنجابی سپاہی بستر پر جھک کر ہنسا۔

''تو میں کیا کہہ رہا تھا، نعیم؟''

''کیا بے سرا نام ہے۔ نعیم......'' دوسرا پنجابی منہ میں بڑبڑایا۔

"تم خطوں کی بات کر رہے تھے۔"

"ہاں۔ خط جب ایک دفعہ پڑھا گیا تو پھر سمجھو وہ ناکارہ ہو گیا۔ پھر وہ گزرے ہوئے زمانے کی بات بن گیا۔ پھر وہ کسی کو کچھ نہیں کہتا۔ جیسے آدمی مر جائے۔ پتہ ہے مردہ آدمی اور خط میں بہت تھوڑا فرق ہے۔ دونوں گزرے ہوئے وقت کی چیزیں ہیں۔ پرانے خط پڑھنا اور مردے پر رونا وقت ضائع کرنے کے برابر ہے۔"

نعیم ہونٹ بھینچ کر سیٹی بجا رہا تھا۔ گاؤں کی زندگی کے' جس نے اس کی روح اور جسم دونوں کا ستیاناس کر دیا تھا' خاتمے پر اس نے ایک بوجھ سینے پر سے اٹھتا ہوا محسوس کیا۔ چھاؤنی کی پابند زندگی' جہاں گاؤں گاؤں سے آئے ہوئے کسانوں نے پہلی بار زندگی میں شدید اکتاہٹ اور غنودگی دیکھی تھی' نعیم کے لئے خوش مزاجی اور لاپروائی لے کر آئی تھی۔ گو اس کا دماغ ابھی تک سلب تھا اور اس نے کبھی سوچنے کی ضرورت محسوس نہ کی تھی' مگر اب وہ ایک معمولی' صحت مند آدمی کی طرح وقت گزار رہا تھا۔

آدھی رات کے قریب وہ فیروز پور چھاؤنی سے گاڑی میں سوار ہوئے۔ مال گاڑی کے خالی ڈبوں میں بھوسہ' گھاس اور باجرے کے ناڑ بچھا کر انہیں سفر کے قابل بنایا گیا تھا۔ سپاہی اپنے اپنے بستر دیواروں کے ساتھ رکھ کر ان کے اوپر بیٹھ گئے۔ ان کی نیند اڑ چکی تھی اور آنکھیں ان کے سگرٹوں کی طرح نیم تاریکی میں تیزی سے چمک رہی تھیں۔ [illegible] بستر پر بیٹھا تھا اور [illegible] میں 'غرغر' کر رہا تھا۔ کونے میں ایک ادھیڑ عمر پنجابی سپاہی پرانے وقتوں کی کوئی کہانی سنا رہا تھا اور اس کے اردگرد چند دس نوجوان دھکتے ہوئے مشتاق چہرے لیے محو سماعت تھے۔ چھت کے ساتھ لٹکی ہوئی دھندلی سی ہری لیمپ ڈول رہی تھی۔ دیواروں پر آدمیوں کے سائے مستقل پھیل اور سکڑ رہے تھے۔

گاڑی سٹیشن پر رکتی تو ڈبے میں حبس ہو جاتا اور لوگ دونوں طرف کے دروازوں پر جمع ہو جاتے۔

"کون سا سٹیشن ہے؟"

"دھرم پاسا۔"

"ہیں؟ کون سا؟ زور سے بول۔"

"کہاں جا رہے ہو؟" سٹیشن پر سے کوئی پوچھتا۔

"لڑائی پر۔"

"اللہ کرم کرے۔"

"اللہ کرم کرے۔"

"کہاں جاتے ہو سائیں؟" آگے سے ایک اور آواز آئی۔

"لڑائی پر....." اگلے ڈبے والے جواب دیتے۔

''کہاں؟''

''لڑائی پر۔''

''پر کہاں۔ کس جگہ؟''

''تیری ماں کے پاس۔'' ڈبہ قہقہوں سے بھر جاتا۔ ''کوئی پیغام؟'' مزید قہقہے۔

عبداللہ نے گھاس پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بوٹ سے نعیم کا گھٹنا ہلایا۔

''ہمیں گھوڑے ملیں گے؟''

''پتہ نہیں۔'' نعیم نے کہا۔

''میں نے اگلے ڈبوں میں کچھ گھوڑے دیکھے ہیں۔''

''وہ افسروں کے لئے ہیں۔''

''اگر وہ کہتے تو میں اپنا گھوڑا ساتھ لے آتا۔''

''اپنی بیوی کو کیوں نہ لے آئے۔''

عبداللہ خاموش بیٹھا گھاس میں انگلیاں دوڑاتا رہا۔ مریض سپاہی کا درد بڑھ گیا۔ اس نے بہت سی گھاس اٹھا کر منہ میں ڈالی اور کرر کرر چبانے لگا۔

''[illegible] پہ ہی اتار دیں گے۔'' [illegible] صوبیدار پاس [illegible] نے کہا۔

''دیکھو۔'' عبداللہ نے گیہوں کی ایک پکی ہوئی بالی گھاس میں سے کھینچ کر نکالی اور چھیلا۔ ''دیکھو۔ یہ یہاں سے نکلی ہے۔ حرامیوں نے پکی ہوئی فصل اٹھا کر ڈال دی ہے۔''

نعیم نے چپکے سے ہاتھ بڑھا کر بالی اس سے لے لی، ہتھیلی پر مسل کر دانے نکالے اور پھونک مار کر چھلکا اڑا دیا۔ ''ایک آدھ بالی تو بھوسے میں بھی چلی جاتی ہے۔''

''ایک آدھ بالی۔'' عبداللہ نے تیزی سے کہا۔ ''تمہاری فصل کا کیا بنا؟ اور میری کا؟ وہ ابھی کھیت میں تھی۔ ہم چلے آئے۔''

''ہنہ..... چلے آئے۔'' تاش کھیلتا ہوا ایک پنجابی طنز سے ہنسا۔

''تم اپنے پیروں پر آئے تھے؟ ہیں؟''

''وہ سئوروں نے کھائی ہوگی یا گاڑیوں میں چھپی ہوگی۔'' عبداللہ نے اندھیرے میں دیکھتے ہوئے بات ختم کی۔

''کل ہمیں بھی سئور ہی کھائیں گے۔ لو کھاؤ۔'' نعیم نے چند دانے منہ میں ڈال کر باقی اس کی طرف بڑھائے جو اس نے ذرا تامل کے بعد لے کر پھانک لئے۔ اناج سیلا اور بے رس تھا لیکن ان کے گرم گرم لعاب کے ساتھ مل کر اس کا میٹھا، سفید گودا گاڑھے خوشبودار دودھ میں تبدیل ہو گیا اور انہوں نے گیہوں کی مخصوص طاقتور حرارت زبان پر، دانتوں میں اور حلق کے اندر اترتی ہوئی محسوس کی۔ دیر تک وہ خاموشی سے گیہوں کے دانے چباتے

UrduPhoto.com

اور باہر تیزی سے بھاگتے ہوئے سیاہ درختوں کو دیکھتے رہے۔ ان کے جبڑے ایک ساتھ' ایک تال پر' پیڈ کرتے ہوئے سپاہیوں کی طرح چل رہے تھے۔

"یہ سارا خون ہے۔" عبداللہ نے منہ میں زبان پھیرتے ہوئے کہا۔

"ہاں۔" نعیم نے اتفاق کیا۔ عبداللہ نے ہوا میں گالی دی۔

تاش کھیلتے ہوئے چاروں سپاہی کسی بات پر قہقہہ لگا کر ہنسے۔ ان کے ساتھ ہی پیٹ کے درد والے نے ایک چیخ ماری اور مٹھیاں پیٹ میں ٹھونس کر دانت گھاس میں گاڑ دیے۔ سب لوگ اس کے گرد اکٹھے ہو گئے۔

"صبر کرو' سٹیشن آنے والا ہے۔" کہانی سنانے والے دیوہیکل سپاہی نے کہا۔

"پانی پلاؤ......" ایک اور نے کہا اور چھاگل بڑھائی۔ مریض نے منہ موڑ کر ایک اور چیخ ماری۔

"گاڑی روکو۔ منہ کیا دیکھ رہے ہو' گدھو' زنجیر کھینچو۔"

"ہاں زنجیر کھینچو۔ زنجیر کہاں ہے؟"

زنجیر کی تلاش شروع ہوئی۔ داستان گو نے لالٹین اتار کر دیوار کے ساتھ ساتھ چلنا شروع کیا۔ آدھے سپاہی اس کے پیچھے پیچھے چلنے لگے۔

"زنجیر نہیں ہے۔" آخر اس نے اعلان کیا۔

"یہ [illegible]"

"یہ جانوروں کا ڈبہ ہے' آدمیوں کا نہیں۔ دیکھتے نہیں ہو؟" ایک نوعمر لڑکے نے گھاس پر ٹھوکر ماری۔

"جانوروں کو زنجیر کی ضرورت نہیں پڑتی۔"

مریض اب سیدھا لیٹ گیا تھا اور ہولے ہولے کراہ رہا تھا۔ گاڑی رکی تو سپاہی دونوں دروازوں پر جا کھڑے ہوئے۔

"کون سا سٹیشن ہے؟" انہوں نے مخصوص سوال دہرایا۔

"اور تم جانوروں کی طرح دروازے میں کیوں کھڑے ہو؟ ہوا آنے دو۔" عبداللہ بستر پر بیٹھے بیٹھے چیخا۔ دو ایک سپاہیوں نے پلٹ کر دیکھا اور سنی ان سنی کر دی۔ وہ تلملا کر اٹھا اور پوری قوت سے کہنی ایک کی پسلیوں میں ماری۔ "ہٹو' مجھے باہر جانے دو۔"

نیچے زمین گیلی تھی اور مٹی میں سے تازہ ہل چلے ہوئے کھیت کی خوشبو آ رہی تھی۔ بارش ابھی ابھی ہو کر تھمی تھی۔ یہ ایک چھوٹا سا دیہاتی سٹیشن تھا جس کے دونوں سروں پر لالٹینیں ویرانی سے جل رہی تھیں۔ دوسری طرف سے آنے والی گاڑی کی روشنی نظر آ رہی تھی۔ سپاہی کود کود کر باہر نکل رہے تھے اور سٹیشن پر پھر رہے تھے۔ جنہوں نے باہر آنا مناسب نہ سمجھا وہ ٹانگیں لٹکائے دروازے میں بیٹھے تھے۔

"مارو' مارو' مارو......" اچانک ایک ڈبے میں شور اٹھا اور بھاگ دوڑ شروع ہوئی۔ کچھ دیر بعد ایک سپاہی